© rasailojaraid.com

# یورپ کی تحریکِ اصلاحِ مذہب

عبد الحمید صدیقی

بہت سے تاریخی حادثات کی طرح یورپ کی تحریکِ اصلاحِ مذہب بھی ایک بہت بڑا تاریخی المیہ ہے۔ مادیت کے علمبرداروں نے اپنے بیشمار وسائل صرف کر کے اس تحریک کے بارے میں یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ مسیحیت کے لیے سراپا راحت تھی۔ اس نے اس کے متزلزل قصر کو سہارا دیا اور مذہب جو دنیا سے قریب قریب ناپید ہونے والا تھا اس میں زندگی کی تازہ روح پھونک دی۔

خواب و خیال کی دنیا میں رہنے والے جو چاہیں کہتے رہیں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اس تحریک سے مسیحیت اور خود مذہب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ یہ تحریک تجدید و اصلاحِ مذہب کا کوئی قابلِ رشک کارنامہ نہ تھا بلکہ مادیت کے سامنے مذہب کی شکست کا کھلا اعتراف تھا۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ مسیحیت "امورِ دنیا" میں انسان کی رہنمائی کرنے سے قاصر ہے اور اس کے ماننے والے اپنے اجتماعی مسائل کو حل کرنے میں یکسر آزاد ہیں۔ مذہب اُن پر کسی قسم کی پابندی عائد کرنے کا مجاز نہیں۔ سرمایہ کی فراہمی، کسبِ معاش، پیدائشِ دولت، تقسیمِ دولت، قوموں کے باہمی تعلقات، نظامِ معیشت کی ہیئت اور نظامِ سیاست اور معاشرت کی ترتیب، الغرض زندگی کے کسی معاملے میں بھی اب مذہب کوئی فیصلہ کُن اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ محض انسان کی روحانی تسکین کا ایک ذریعہ ہے اور اُسی شخص کے لیے کچھ مفید اور کارآمد ہو سکتا ہے جو روحانیت کے خبط میں مبتلا ہو۔ عام انسانوں کے لیے یہ کسی اہمیت کا حامل نہیں اور وہ اس سے جس قدر دامن بچا کر چلیں اُن کے لیے بہتر ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس تحریک کا آغاز اصلاح مذہب کے مقدس جذبے سے ہوا لیکن اس جذبے نے جو عملی صورت اختیار کی وہ سرتاپا مذہب سے انحراف اور بغاوت تھی اور اس کا تجدیدِ مذہب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے کوئی تعلق نہ تھا۔ آئیے سب سے پہلے ذرا اُس اندوہناک صورتِ حال کا جائزہ لیں جس کی اصلاح کے لیے مارٹن لوتھر اور اس کے متبعین اُٹھے تھے۔

اس دور کی مذہبی حالت کا جو نقشہ ہمیں مختلف کتب میں ملتا ہے اُس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی حلقوں میں سب سے زیادہ اضطراب سائنس کے انکشافات سے پیدا ہوا۔ خداوندانِ کلیسا خالقِ کائنات اور کائنات کے بارے میں جن تصورات کو ایمانیات کی حیثیت سے خود مانتے چلے آرہے تھے اور مسیحیت کے پیروؤں سے تسلیم کروانے پر مُصر تھے انہیں سائنس کی نئی معلومات سے سخت دھچکا لگا۔ معرکۂ مذہب و سائنس کے فاضل مصنف ڈاکٹر ولیم ڈریپر نے ان اعتقادات کی بڑی تفصیل درج کی ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ پادریوں کے نزدیک زمین کو چپٹا سمجھنا ایمان کا ضروری جزو خیال کیا جاتا تھا لیکن سائنس کی تحقیقات نے اُسے گیند کی مانند گول ثابت کر دیا۔ پھر ان مذہبی طبقوں کے خیال کے مطابق یہ زمین ساکن سمجھی جاتی تھی اور باقی اجرام فلکی اس کے گرد گھومتے ہوئے تصور کیے جاتے تھے۔ لیکن سائنس دانوں نے اس خیال کو جھٹلا دیا اور زمین کی گردش کا نظریہ پیش کیا۔

اگر اُس دور کا مذہبی طبقہ ذرا عقل و دانش سے کام لیتا تو سائنس اور مذہب کے درمیان کسی قسم کی کشمکش نہ پیدا ہوتی لیکن اس طبقے نے قدیم عیسائیوں کی سائنسی تحقیقات کو بھی ایمانیات میں شامل کر لیا اور ہر اُس فرد کو ملحد، بے دین اور دہریہ قرار دیا جو قدیم جغرافیہ دانوں اور سائنس دانوں کے نظریات کی صحت کو پوری طرح تسلیم نہ کرتا تھا۔ پھر اس طبقے نے مزید حماقت یہ کی کہ ان فرسودہ تصورات کو جن کا مذہب سے کوئی دور کا بھی تعلق نہ تھا لوگوں سے بالجبر منوانے کی کوشش کی اور جن منچلوں نے انہیں ماننے سے انکار کیا انہیں بڑی عبرتناک سزائیں دیں۔

اگر ان لوگوں میں سے کوئی طبقہ فہم و فراست سے کام لیتا تو سائنس اور مذہب کے درمیان یہ کشمکش کوئی تشویشناک صورت اختیار نہ کرتی۔ اصلاح مذہب کے علمبرداروں کا اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معاملے میں سب سے پہلا اور بنیادی فرض تھا کہ وہ سائنس اور مذہب کے دائرۂ کار متعین کرتے اور عوام کو بتلاتے کہ انجیل کوئی جغرافیہ یا ہیئتِ ارضی کی کتاب نہیں ہے بلکہ کتابِ ہدایت ہے۔ اس کا کام آفاق کے مستور گوشوں کے متعلق معلومات فراہم کرنا نہیں بلکہ انسان کے اخلاق کو سنوارنا اور کائنات، اُس کے خالق اور انسان کے درمیان جو مختلف رشتے قائم ہیں انہیں صحیح بنیادوں پر استوار کرنا ہے۔

یہ تحریکِ اصلاحِ مذہب کی سب سے پہلی ناکامی تھی جس نے تبدیلی کے دھارے کو خالص الحاد کی بنیاد پر ڈال دیا۔ ہیئتِ ارضی کے بارے میں جب مذہبی نظریات کی صحت مخدوش ہوئی تو لوگوں کے دلوں میں پورے مذہب کے بارے میں مختلف شکوک و شبہات پیدا ہونے لگے اور انہوں نے جب یہ دیکھا کہ مذہبی طبقہ شکوک کے ان کانٹوں کو حکمت و دانائی کے ساتھ چننے کے بجائے اندھی بہری طاقت کے بل پر بعض غیر عقلی باتوں کو منوانے پر بے جا اصرار کر رہا ہے تو انہوں نے سارے مذہبی نظام کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا۔

تجدید و اصلاحِ مذہب کا دوسرا میدان کلیسا کا نظام تھا۔ یہ نظام اپنی اساس کے اعتبار سے بڑا مفید اور کارآمد ہے اور اس نے دینِ مسیحی کو پھیلانے میں بڑی قابلِ قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ پھر اس کی آغوش میں بعض افراد نے مذہبی نقطۂ نظر سے بڑی اچھی تربیت پائی اور وہ سیرت و کردار کے اعتبار سے مسیحیت کے نہایت اعلیٰ نمونے ثابت ہوئے۔ اس نظام نے آغاز میں بے کسوں اور بے سہارا لوگوں کو پناہ دی اور یتیموں اور بیواؤں کی معاونت اور دستگیری کی، طلبا کو اس کے مالیات سے معقول وظائف دیئے گئے اور انہوں نے پوری یکسوئی کے ساتھ اپنی تعلیمی سرگرمیوں کو جاری رکھا۔

ان خدمات کے علاوہ کلیسا نے ظالم بادشاہوں اور سفاک اُمراء کے ظلم و ستم کے خلاف آغاز میں ایک مضبوط حصار کا کام دیا۔ ان بگڑے ہوئے اصحابِ اقتدار سے بچنے کے لیے ستم رسیدہ لوگ کلیساؤں کا رُخ کرتے اور ان کے جرأت مند محافظ اور نگراں بڑی جرأت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور بے باکی سے ظلم کا مقابلہ کرتے بلکہ بسا اوقات وہ مظلوموں کی حمایت میں جان تک قربان کر دیتے۔ یہ ان پاکباز لوگوں کے جذبۂ ایثار اور جرأت کا نتیجہ تھا کہ مطلق العنان بادشاہ اپنی روش کو ایک ضابطے اور قاعدے کے مطابق ڈھالنے پر مجبور ہو گئے اور جب کبھی انہوں نے طاقت کے نشے میں بدمست ہو کر غریب عوام کو اپنے مظالم کا تختۂ مشق بنانے کی کوشش کی تو کلیسا کے خادموں نے بڑی جوانمردی اور ہمت و استقلال کے ساتھ ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ کلیسا صحیح معنوں میں آفت رسیدہ لوگوں کے لیے حصار کی حیثیت رکھتے تھے جہاں زخموں سے چُور انسانیت پناہ لے کر اپنی زندگی کو مامون و محفوظ پاتی۔

مگر افسوس یہ صورتِ حال دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ کلیساؤں کو نقدی، اراضی اور غلے کی شکل میں جو عطیات ملتے رہے انہوں نے پادریوں اور راہبوں کو دنیا پرست بنا دیا اور وہ مال و دولت کی محبت میں کھو کر اپنے اصل فرائض سے یکسر غافل ہو گئے۔ پھر ان کلیساؤں کی طرف جن نوجوانوں نے تعلق باللہ قائم کرنے کے لیے رجوع کیا ، اُن میں سے ایک بڑی قلیل تعداد ہی کامیاب ہوئی۔ ان کی عظیم اکثریت نے ضبطِ نفس، اخلاقِ حسنہ، خدا خوفی اور پرہیزگاری کا سبق سیکھنے کی بجائے عیش پرستی کے گُر سیکھے۔ پادریوں کی اخلاق سوز حرکات نے ان نوجوانوں کو ذہنی آوارگی میں مبتلا کر دیا۔ خانقاہوں میں نوجوان راہبوں اور راہبات کی یکجائی نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور دیکھتے دیکھتے مسیحیت کے ان مذہبی مراکز کی ساری فضا مکدر ہو کر رہ گئی۔ اس سلسلے میں ایک نامور مورخ کی تصریحات ملاحظہ ہوں۔

> وہ کلیساؤں کے خادم روپے پیسے کے معاملے میں اتنے ہی حریص اور بد دیانت تھے جتنے کہ اُس دور کے سرکاری ملازم، بد دیانتی اُن کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی جس طرح عام عدالتوں میں انصاف کو خریدا جا سکتا تھا بالکل اسی طرح مذہبی عدالتوں کے فیصلوں پر بھی لوگ روپے کی مدد سے اثر انداز ہو جاتے تھے ....... ہر بڑے سے بڑے گناہ کی رعایت مل سکتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھی[1]۔"

ایک دوسرا راہب اپنے ساتھیوں کے اعمال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"ان لوگوں کا سارا دن فحش کلامی اور عیش و عشرت میں گزرتا ہے۔ . . . ان کے دل خوفِ خدا سے یکسر خالی ہیں اور باری تعالیٰ کی محبت کے بجائے ان کے قلب و دماغ پر دنیا کی محبت چھائی ہوئی ہے۔ آخرت کا تصور اور احساس جوابدہی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ جنسی لذات کی تسکین اب زندگی کا سب سے زیادہ پسندیدہ مشغلہ بن کر رہ گیا تھا[2]۔"

مغفرت ناموں اور جنت کے قبالوں کی فروخت نے لوگوں کو گناہ کے ارتکاب میں کافی حد تک جری بنا دیا تھا۔ اُن کے دلوں میں یہ خیال پوری طرح راسخ ہو چکا تھا کہ وہ روپے کے صرف سے نہایت گھناؤنے سے گھناؤنے جرم کو بآسانی معاف کروا سکتے ہیں۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے چانسلر نے ۱۴۵۰ء میں عوام کی اس دیدہ دلیری کا مندرجۂ ذیل الفاظ میں تذکرہ کیا ہے:

"آج کل مجرم اور گناہ گار بڑی بے تکلفی سے یہ کہتے ہیں مجھے اس بات کی ذرہ برابر پروا نہیں کہ میں کتنی برائیوں کا ارتکاب کر رہا ہوں کیونکہ میں نے پوپ سے چار پانچ پنس میں مغفرت نامہ خرید لیا ہے[3]۔"

کلیسا کی یہ اندوہناک اخلاقی حالت اس بات کی متقاضی تھی کہ مسیحیت کے سچے پیروؤں میں کوئی فرد یا گروہ اٹھتا اور اس نظام کے اچھے اور روشن پہلوؤں کو جوں کا توں برقرار رکھ کر اس کے اندر جو برائیاں راہ پا چکی تھیں انہیں دور کرتا لیکن تحریکِ اصلاحِ مذہب کے علمبرداروں نے اس پورے نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔

کلیسا کی سب سے بڑی افادیت یہ تھی کہ اس نے مختلف قوموں اور ملکوں سے تعلق رکھنے والے

---

[1] WILL DURANT : THE STORY OF CIVILIZATION PART VI. P. 18.

[2] CAULTON : LIFE IN THE MIDDLE AGE VOL. I. P. 410

[3] THE STORY OF CIVILIZATION P. 23.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

افراد کو اخوت کے روحانی رشتے میں منسلک کر رکھا تھا، پھر اس کلیسا کی بدولت اہلِ یورپ مذہبی ضابطوں کے پابند تھے۔ اس کے تحت افراد کی تربیت کی جاتی تھی۔ پوپ کی ذات عوام کی عقیدت کا محور و مرکز تھی اور اس طرح عوام کے اندر ایک مذہبی احساس بیدار رہتا تھا۔ تحریکِ تجدیدِ مذہب کے علمبرداروں نے بڑی نادانی سے کلیسا کے ان روشن پہلوؤں کو یکسر نظر انداز کر دیا اور کلیسا کی بین الاقوامی حیثیت ختم کر کے ان مذہبی اداروں کی باگ ڈور ہر ملک کے فرمانروا کے سپرد کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب انسانی رشد و ہدایت کا ذریعہ بننے کے بجائے دنیا پرست اصحابِ اقتدار کے ہاتھ میں آلۂ کار بن کر رہ گیا۔ کلیسا اب غریبوں کا سہارا اور پناہ گاہ نہ تھا بلکہ فرمانرواؤں کے اقتدار کا مرکز تھا۔ کلیسا کے ہاتھ میں آجانے کے بعد برسرِ اقتدار طبقہ جس طرح چاہتا سادہ لوح عوام کو مذہب کے نام پر لوٹتا۔ پہلے جو ریشہ دوانیاں بگڑے ہوئے راہب اور پادری بڑے محدود پیمانے پر کر رہے تھے وہ اب فرمانرواؤں نے بڑے وسیع پیمانے پر کرنی شروع کر دیں۔ اوقاف کے بڑے وسیع ذرائع اور ان کی غیر محدود دولت نیک اور مقدس کاموں پر صرف ہونے کے بجائے برسرِ اقتدار طبقوں کی عیاشیوں پر صرف ہونے لگی اور اس دولت پر ایک ایسا گروہ پلنے لگا جسے مذہب سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہ تھا بلکہ جس کی زندگی کا مقصد باری تعالیٰ کی پرستش کے بجائے تخت و تاج کے وارثوں کی پرستش تھا۔

ممکن ہے سطح بیں آنکھیں اس تبدیلی کو کوئی معمولی تبدیلی سمجھیں، لیکن جو حضرات مذہب کی تاریخ سے واقفیت رکھتے ہیں وہ اس حقیقت سے اچھی طرح شناسا ہیں کہ کلیسا کو حکومت کا تابع مہمل بنانے سے مسیحیت کا سلسلہ ٹوٹ کر رہ گیا اور اس کے بعد مسیحیت اپنے حفظ و بقا تک کے لیے حکمرانوں کی چشمِ التفات کی محتاج ہو گئی۔ وہ اب مذہب سے جس طرح چاہتے کام لیتے۔ انہیں کوئی ٹوکنے والا نہ تھا۔ اس مرکز کے ایک مرتبہ ٹوٹ جانے کے بعد یورپ میں پھر مذہب برابر پسپا ہوتا چلا گیا اور پسپائی کا یہ سلسلہ آج تک جاری ہے بلکہ اب صورت یہاں تک جا پہنچی ہے کہ مذہب کا انسان کی عملی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔

پھر کلیسا کے مرکزی نظام کے درہم برہم ہونے کے بعد ہر ملک نے سیاسی تقاضوں کے پیشِ نظر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسیحیت کا اپنا ایک الگ ایڈیشن تیار کیا۔ چنانچہ اگر ایک ملک میں مسیحیت جمہوریت کی ہمنوا تھی تو دوسرے ملک میں آمریت کی علمبردار۔ ایک ملک میں اگر یہ فرد کی آزادی کے حق میں تھی تو دوسرے ملک میں وہ اس آزادی کی سب سے بڑی دشمن تھی۔ مذہبی دائرے میں فکر و عمل کے اس انقلاب نے مذہب کی رہنما حیثیت ختم کر کے اُسے برسرِ اقتدار طبقوں کے ہاتھ میں ایک کھلونا بنا دیا تھا جس سے وہ جس طرح چاہتے بے تکلف کھیلتے۔

بگڑے ہوئے راہبوں اور پادریوں نے بلاشبہ مذہب کو نقصان پہنچایا لیکن جس قسم کا نقصان اُن سے پہنچ رہا تھا وہ قابلِ تلافی تھا۔ انسانی ضمیر نے ہمیشہ بُرائیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے اِس بنا پر اس بات کی پوری توقع تھی کہ تجدید و اصلاح مذہب کی کوئی اچھی تحریک اٹھ کر مذہبی طبقوں کے ضمیر کو جھنجھوڑتی اور انہیں صورتِ حال کی اصلاح پر آمادہ کرتی۔ لیکن مذہب کو اقتدار کا تابع بنانے سے مذہب کی افادیت یکسر ختم ہوگئی اور یہ واقعی انسانیت کے لیے افیون بن کر رہ گیا جس سے حکمرانوں نے عوام کے شعور اور احساس کو مُردہ کرنے میں پُورا پورا کام لیا۔

یورپ کی تحریکِ اصلاحِ مذہب کا ایک افسوسناک پہلو یہ بھی ہے کہ جو لوگ کلیساؤں میں اخلاقی بگاڑ کو دُور کرنے کے لیے اٹھے تھے وہ خود مختلف نوعیتوں کی اخلاقی بیماریوں میں مبتلا تھے اور انہوں نے ان مذہبی اداروں میں بُرائی کو مٹانے کے بجائے اسے اپنے غلط نظریات کی وجہ سے قوت فراہم کی۔

وہیبر اور ڈینی فائل نے لوتھر کے مکتوبات میں سے بعض ایسے اقتباسات نقل کیے ہیں جن سے اُس کی اخلاقی بے راہ روی کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔ اس نے اپنے متبعین کو راہبات کی عصمت دری پر اُبھارا اور اس مذموم فعل کو ایک بہت بڑی دینی خدمت سمجھ کر اس کی تعریف کی۔ آرنلڈ لون نے لوتھر کا ایک خط نقل کیا ہے جس میں وہ کوپ جیسے شخص کو جو عفت کا لٹیرا تھا ایک "مقدس ڈاکو" کا خطاب دیتا ہے اور اس کے اس قبیح فعل کو بڑے زوردار الفاظ میں سراہتا ہے۔ ایک دوسرا مصنف ڈینی فائل لوتھر کے ایک عاشقِ زار کی "فتح مندیوں" کے تاثرات یوں قلمبند کرتا ہے۔ وہ لوتھر کو مخاطب کرتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



ہوئے لکھتا ہے:

"نو راہبات ہمارے حصے میں آئی ہیں، وہ حسین اور خوبصورت ہیں اور اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اُن میں سے ایک جس کی عمر پچاس برس کی ہے وہ آپ کے لیے مختص ہے۔ اگر آپ نوعمر کے خواہشمند ہوں تو اُس کے دینے میں بھی ہمیں کوئی تامل نہیں[1]"

تاریخ کا یہ کتنا عظیم المیہ ہے کہ جو شخص پادریوں اور راہبوں کے اخلاقی انحطاط پر زبردست احتجاج کرتا ہے اور اس اندوہناک صورتِ حال کو بہتر بنانے کے لیے اصلاحِ مذہب کی ایک تحریک اٹھاتا ہے وہ خود نیکی اور بدی کے بارے میں نہایت گمراہ کن نظریات کا پرچار کرتا ہے۔ وہ لوگوں کو بڑے واشگاف الفاظ میں یہ کہتا کہ اگر تمہیں گناہ کرنا ہے تو جراُت کے ساتھ کرو۔ جب شیطان تمہیں اس کی ترغیب دے تو تمہارا فرض ہے کہ تم خلوت سے نکل کر جلوت میں آجاؤ اور جی بھر کر شراب پیو۔ کبھی کبھار انسان کو نشے میں بدمست ہو جانا چاہیے، اور مختلف قسم کی بیہودگیوں کا بڑی خوشدلی سے ارتکاب کرنا چاہیے تاکہ اس کا ضمیر غیر معمولی حد تک حساس نہ رہے اور معمولی معمولی گناہوں سے اس میں اضطراب نہ پیدا ہونے پائے۔ اسی وجہ سے میں نے یہ وطیرہ اختیار کر رکھا ہے کہ جب شیطان مجھے بُرائی سے روکتا ہے تو میں بڑے شوق کے ساتھ بُرائی کا ارتکاب کرتا ہوں اور فحش کلامی سے اپنا دل بہلاتا ہوں اور اس طرح شیطان کے تسلط سے اپنے آپ کو نجات دلانے میں کامیابی حاصل کرتا ہوں[2]"

لوتھر انسان کی مذہبی ذمہ داری کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"خدا کا انسان پر اس کے علاوہ اور کوئی حق نہیں کہ صرف اُس کے وجود کو تسلیم کیا جائے۔ باقی تمام معاملات میں انسان آزاد ہے اور وہ ضمیر کی معمولی خلش کے بغیر اپنے منشا اور مرضی کے مطابق ہر فعل کا ارتکاب کر سکتا ہے۔ وہ شخص جو یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ یسوع مسیح نے اُس کے گناہوں کا کفارہ دے دیا ہے وہ اُس مقدس ذات کی طرح ہی پاکیزہ اور بے گناہ ہے[3]"

---

1. REVOLT AGAINST REASON. P. 40
2. " " P. 61
3. " 55



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ غالباً لوتھر کی اسی آزاد مشربی کا نتیجہ تھا کہ اس کے متبعین میں ایسے لوگ شامل ہو گئے جن کی عظیم اکثریت مذہب سے کوئی گہرا تعلق نہ رکھتی تھی بلکہ یہ گروہ اُن لوگوں پر مشتمل تھا جو مذہبی بندھن توڑ کر حسی لذات کی تسکین کے آرزومند تھے اور اس معاملے میں دل کے سارے ارمان نکالنے کے لیے بیتاب تھے۔ اس حقیقت کا خود لوتھر نے اعتراف کیا ہے:

"میں اپنے اردگرد ایسے لوگوں کو جمع پاتا ہوں جنہوں نے لذت کے حصول کے لیے خانقاہوں کا رُخ کیا اور اب اسی مقصد کی خاطر انہیں خیرباد کہہ دیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔
اب جبکہ ایک بُرائی کا خاتمہ ہوا ہے تو متعدد نئی برائیاں اُبھر کر سامنے آگئی ہیں۔ آج لوگ پوپ کے عہدِ اقتدار کی بہ نسبت کہیں زیادہ حریص، سفاک اور ناعاقبت اندیش ہیں۔ حسد، کینہ، روپے پیسے کی نہ مٹنے والی ہوس، اخلاقی بے راہ روی، جھوٹ، مکر اور فریب کا دَور دورہ ہے۔ اس قسم کی غیر منضبط زندگی کو دیکھ کر کبھی کبھی احساس ہوتا ہے کہ کہیں ہماری انجیل ہی میں کوئی سقم تو نہیں کیونکہ اگر اس کی تعلیمات بالکل صحیح اور برحق ہیں تو پھر اس کے پیرؤوں کو زیادہ نیک اور خدا ترس ہونا چاہیے تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہم دینِ مسیحی کی تبلیغ و اشاعت میں جس قدر جذب و شوق اور انہماک کا ثبوت دیتے ہیں اُسی نسبت سے لوگوں کی دینی حالت بگڑتی چلی جاتی ہے۔ کاش مجھے اس تحریک اور اس کے ان روح فرسا نتائج کا دس بارہ برس پیشتر کچھ بھی اندازہ ہوتا تو میں اس کا کبھی آغاز نہ کرتا۔"[1]

اس تحریک کی وجہ سے اخلاقی انارکی کا جو طوفان اٹھا وہ یورپ کی معاشرتی زندگی کے لیے بڑا تباہ کن تھا اور اس کی وجہ سے خیر و شر کے سارے تصورات بالکل برباد ہو کر رہ گئے۔ لوتھر کے ایک بہت بڑے معتقد نے عوام کی اخلاقی حالت کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:

"بہت سے لوگ اب اس انداز سے زندگی بسر کرتے ہیں جیسے کہ انہیں ہر قسم کی

---

[1] REVOLT AGAINST REASON P. 62

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

برائیوں کے ارتکاب کی کھلی چھٹی مل چکی ہے اور شیطان کا وجود قطعاً باقی نہیں رہا۔ انہیں اب نہ تو دوزخ کا ڈر ہے اور نہ باری تعالیٰ کے احتساب کا کوئی خطرہ"

مارٹن لوتھر اور اُس کے رفقائے کار کے یہ تاثرات کوئی سربستہ راز نہیں جن کا کھوج لگانے میں انسان کو کوئی دقت محسوس ہو رہی ہو۔ جو شخص بھی تحریکِ اصلاحِ مذہب کے علمبرداروں کی تحریروں کا مطالعہ کرے گا اُسے اس تحریک کے خطرناک اخلاقی نتائج کی بیسیوں شہادتیں ملیں گی۔

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مذہبی طبقوں کی دنیا پرستی نے کلیسا اور خانقاہوں کی حالت کو اخلاقی اور دینی اعتبار سے کافی حد تک تباہ کر دیا تھا اور صورتِ حال کی اصلاح ناگزیر تھی لیکن مارٹن لوتھر کے ہاتھوں اصلاح مذہب کی جو تحریک اٹھی اُس نے حالات کو سنوارنے اور بہتر بنانے کے بجائے انہیں مزید خراب کیا۔ اوباش اور اخلاق باختہ لوگ جو مذہب کے نظامِ اخلاق کے پابند نہ تھے اور ان پابندیوں کو حسی لذات کی تسکین میں مانع سمجھتے تھے وہ فوراً اس تحریک میں شامل ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں کے ہاتھوں اخلاقی ضابطے بالکل تار تار ہو کر رہ گئے۔ چنانچہ خود لوتھر نے متعدد جگہ اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ جن برائیوں کے سدباب کے لیے اُس نے اس تحریک کو اٹھایا تھا۔ اُس میں وہ سخت ناکام ثابت ہوا اور ان برائیوں سے کہیں زیادہ شدید مفاسد نے پوری قوت کے ساتھ سر اٹھایا[۱]۔

اس تحریک کے علمبرداروں نے مذہب کو ایک اور نقصان یہ پہنچایا کہ لوگوں کے لیے کتاب مقدس کی من مانی تاویلات کا دروازہ کھول دیا۔ اس کام کے لیے زمین بڑی چابکدستی سے ہموار کی گئی۔ سب سے پہلے لوگوں کی توجہ اس بدیہی حقیقت کی طرف مبذول کرائی گئی کہ یہ ایک کتابِ ہدایت ہے اور ہدایت کا ہر فرد محتاج ہے اس لیے اس کے سمجھنے کا ہر شخص کو پورا پورا حق حاصل ہونا چاہیے۔ یہ بات ہر لحاظ سے صحیح اور درست تھی۔ چنانچہ عوام نے اسے اپنے دل کی آواز سمجھ کر بڑی خوشدلی کے ساتھ قبول کیا۔ اور اُن کے اندر بائیبل کے معانی اور مطالب سمجھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس ذوق کی تسکین کے

۱ REVOLT AGAINST REASON P. 63.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیے کتابِ مقدس کے متعدد تراجم شائع ہوئے، اور لوگ ان تراجم کے پڑھنے میں منہمک ہو گئے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ تراجم اصل کتاب کی بلاغت، اُس کی فکر انگیزی، اس کے سوز و گداز اس کی گہری معنویت کو اپنے دامن میں پوری طرح سمیٹنے سے قاصر تھے۔ چنانچہ اس کا سب سے پہلا اثر یہ ہوا کہ عوام کے شعور و وجدان کا رشتہ الہامی زبان سے کٹ گیا اور کتابِ الٰہی اور اس کے الفاظ کی تقدیس غیر شعوری طور پر دلوں سے ٹلنے لگی۔

پھر لوگوں کو یہ باور کرایا گیا کہ خالق و مخلوق کے درمیان ان "پیرانِ کلیسا" نے جو پردے حائل کر رکھے ہیں یہ سراسر ظلم و زیادتی ہے اس لیے سب سے پہلے اس طبقے کو ختم کرنا چاہیے۔ کتابِ مقدس کی تعبیر و تشریح اُن کا کوئی خصوصی اور موروثی حق نہیں کہ اُن کی تعبیرات کو ہی صحیح اور برحق سمجھا جائے۔ یہ حق ہر شخص کو حاصل ہے۔ یہ بات بھی بظاہر بالکل صحیح معلوم ہوتی تھی۔ چنانچہ اس کی صحت کو ہر ہوشمند شخص نے تسلیم کیا مگر جب اس کے عملی مضرات سامنے آئے تو اس سے پورے مذہب کا حلیہ بگڑ کر رہ گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کتابِ مقدس کو سمجھنے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے لیکن اس کام کے لیے ایک خاص معیار کی قابلیت بھی تو ضروری ہے۔ کلیسا کا نظام اس مقصد کے لیے برسوں افراد کی تربیت کرتا تھا اور پھر کہیں جا کر وہ انہیں اس کا اہل قرار دیتا تھا لیکن اس تحریک نے یہ صورتِ حال پیدا کر دی کہ ہر کس و ناکس نے بائبل کے مطالب کی از خود تحقیقات شروع کر دی۔ جو شخص بھی معمولی لکھ پڑھ سکتا تھا اُس نے اس کے مفہوم اور مدعا کو متعین کرنے کی کوشش کی۔ اگر معاملہ محض سمجھنے کی حد تک محدود رہتا تو پھر بھی اس بائبل فہمی کے نتائج زیادہ خطرناک نہ ہوتے لیکن ان من چلوں نے اپنے آپ کو کتابِ مقدس کی تعبیر اور اس سے فقہی استدلال اور استنباط کے لیے موزوں اور اہل خیال کیا اور انہوں نے اس کے احکام کی اپنے حسبِ منشا اور مرضی تشریح و توجیہ کی اور اس طرح یہ مقدس کتاب بازیچۂ اطفال بن کر رہ گئی۔

مذہب میں ایک ضروری عنصر روایت کا بھی ہے۔ روایات کے مقدس اور لطیف تار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ماضی کو حال اور مستقبل سے مربوط کرتے ہیں۔ مذہب کو ایک انقلاب انگیز تحریک، ایک زندہ قوتِ فکر و عمل بنانے میں روایات کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ ان کے اثر کے تحت انسان خارجی پابندی کے بغیر خود اپنے آپ کو ایک اخلاقی نظام کا پابند بناتا ہے۔ اپنے سامنے سیرت و کردار کے اعلیٰ نمونے پا کر بغیر کسی دباؤ کے، اپنی زندگی کو اُن کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ روایات مثبت طور پر انسان کی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ہر نبی نے اپنے پیچھے جہاں لوگوں کی رشد و ہدایت کے لیے الہامی کتاب چھوڑی وہاں اس نے اچھی اور مقدس روایات کا ایک بیش قیمت سرمایہ بھی چھوڑا جس کے پس منظر میں لوگوں نے کتابِ الٰہی کے معانی و مطالب متعین کیے۔ اس پس منظر کو نظر انداز کرنے سے بعض اوقات سارے دین کا تصور بدل جاتا ہے۔

تحریکِ اصلاحِ مذہب کے علم برداروں نے روایات کی اس غیر معمولی افادیت سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، انہیں برباد کرنے کی کوشش کی۔ ان کا موقف یہ تھا کہ یہ روایات بیکار کی زنجیریں ہیں۔ یہ کتابِ الٰہی کے مطالب کو محدود اور انسانی عقل کو مفلوج کرتی ہیں۔ اس دعویٰ میں بلاشبہ ایک جزو صداقت کا بھی ہے بعض غلط قسم کی روایات مذہبی نظام میں راہ پا کر اس کی ترقی کی راہ میں سنگِ گراں کا کام دیتی ہیں اور انسانی عقل و شعور کو پُوری طرح برومند ہونے کا موقع نہیں دیتیں لیکن اس سے بڑی نادانی اور کیا ہو سکتی ہے کہ محض چند ایسی روایات کی آڑ لیکر اس پورے نظام کو درہم برہم کر دیا جائے اور اس کے ایک ایک نقش کو مٹانے کی ناپاک کوشش کی جائے۔ اس غلط طرزِ فکر کے جو نتائج یورپ میں رُونما ہوئے وہ بہت حوصلہ شکن ہیں اور انہیں دیکھ کر اس طرزِ استدلال کی غلطی کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ روایات کے بندھنوں نے اہلِ یورپ کو فکری اور جذباتی اعتبار سے ایک دوسرے سے جوڑ رکھا تھا۔ پھر ان کی تقدیس کی وجہ سے عوام کے دلوں میں ضبطِ نفس کا احساس بیدار تھا اور اس طرح معاشرتی زندگی کی تشکیل میں ناروا جکڑ بندیوں کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی لیکن جب روایات کے یہ بندھن ٹوٹے تو لوگوں کے سفلی جذبات میں زبردست تلاطم پیدا ہوا۔ اخلاقی قدریں جن کی وجہ سے ایک اجتماعی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نظامِ قائم تھا وہ یکسر پامال ہو گئیں اور انسانوں کو اپنے جائز حدود میں مقید رکھنے اور انہیں اجتماعی زندگی کی ذمہ داریوں کا پابند بنانے کے لیے آمریت کا ایک نہایت جابرانہ نظام وضع کرنا پڑا۔ چنانچہ خود لوتھر اس نوعیت کے نظام کی بڑے زوردار الفاظ میں حمایت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ریاست کے جابرانہ نظام کے بغیر کسی اچھے معاشرے کی تعمیر نہیں کی جا سکتی۔[1] وہ انسانی آزادی اور مساوات کے مذہبی تصورات کو یکسر باطل سمجھتا ہے اور حکومت کو اس بات کا پورا پورا اختیار دیتا ہے کہ وہ افراد اور دیگر انسانی اور مذہبی اداروں کی آزادی کو اپنے مفادات کے پیشِ نظر کچل کر رکھ دے۔

روایت سے بغاوت اور آمریت دونوں کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تاریخ انسانی اس بدیہی حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ جن تحریکات نے بھی عوام کو روایات کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کی دعوت دی انہوں نے ایک سخت گیر آمرانہ نظام کی بھی حمایت کی کیونکہ اگر انسان ازخود اپنے آپ کو کسی آئین وضابطے کا پابند بنانے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا تو اسے خارجی جکڑ بندیوں کے ذریعہ ہی کسی مخصوص روش پر چلنے کے لیے مجبور کیا جا سکتا ہے۔

تحریکِ اصلاحِ مذہب کے علمبردار اس کے فوائد بیان کرتے ہوئے بڑے فخر سے یہ بات کہتے ہیں کہ یہ تحریک درحقیقت عقل کی جذبات پر فتح تھی۔ اس کے بعد انسان نے مذہبی معاملات پر عقل کی روشنی میں غور کرنا شروع کیا اور خلافِ عقل باتوں کو دین سے خارج کر کے رکھ دیا۔ مارٹن لوتھر نے اپنی بعض تحریروں میں عقل کے نور کی بڑے والہانہ انداز میں تعریف کی ہے۔

"انسان کو قدرت نے جس قدر عطیات دیئے ہیں اُن میں عقل سب سے بہتر عطیہ ہے، یہ تمام علوم وفنون کی جان، قوت کا سرچشمہ، نیکی، پرہیزگاری، عزت و وقار کا سب سے بڑا مخزن ہے۔ انسان کو دوسری مخلوقات سے صرف عقل ہی ممیز اور ممتاز کرتی ہے۔[2]"

لیکن دوسرے مقامات پر وہ اسی عقل کے خلاف دل کھول کر زہر اگلتا ہے اور اسے سب سے

---

۱؎ REVOLT AGAINST REASON P. 64.

۲؎ CHRLES BEARD: THE REFORMATION P. 154.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com


زیادہ خطرناک درندے اور اژدہے سے تعبیر کرتا ہے۔ کبھی وہ اسے شیطان کی بدصورت دلہن اور باری تعالیٰ کا سب سے بڑا دشمن کہتا ہے۔ ایک مقام پر وہ عقل کی حدود و قیود کی تصریح کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس سے زندگی کے عام معاملات میں تو رہنمائی لی جا سکتی ہے لیکن مذہبی اور روحانی امور میں یہ بالکل بیکار رہے کیونکہ ایمان اور عقل ایک دوسرے کی ضد ہیں۔[1]

یوں تو لوتھر کے سارے کلام میں ہمیں عجیب و غریب تضاد نظر آتا ہے لیکن عقل کے بارے میں اُس نے جو مخالف موقف اختیار کیے ہیں وہ اس کی فکری کجی کے ہر لحاظ سے آئینہ دار ہیں۔ اُس کے حامیوں نے اس تضاد کو دُور کرنے کی بھی کوشش کی ہے لیکن وہ اس میں قطعاً کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس تضاد کی وجہ لوتھر کی کوتاہ اندیشی، فکری بے راہ روی اور پست ہمتی ہے۔ اس نے عقل کی آڑ میں مذہبی روایات اور اس کے ضابطۂ اخلاق کے خلاف بغاوت کی۔ پھر اس عقل کی بنیاد پر ہی کلیسا سے جنگ لڑی اور کتابِ مقدس کی من مانی تاویلات کیں۔ ان کاموں میں چونکہ عقل کی بالادستی تسلیم کرنے سے کامیابی کا حصول ممکن تھا اس لیے اس نے ان معاملات میں عقل کی فضیلت بیان کی لیکن مسیحیت اور اس کے نظام میں بعض باتیں ایسی بھی ہیں جنہیں لوتھر اور اُس کے ساتھی خالص عقلی اساس پر صحیح اور برحق ثابت کرنے سے قاصر تھے اس لیے انہوں نے عقل کو کوسنا شروع کیا۔ پھر خود لوتھر نے جو نظریات پیش کیے اُن میں سے بیشتر ایسے تھے جن کی کوئی عقلی توجیہ ممکن نہ تھی اس لیے وہاں عقل کی بے بسی اور عاجزی کو اُبھارا گیا اور جذبات کی افادیت پر زور دیا گیا۔ اُس نے ان خیالات کا کئی مقامات پر اظہارِ خیال کیا ہے:

"وہ سارے ارکانِ مسیحیت جن کی خداوند تعالیٰ نے کتابِ مقدس میں نشاندہی کی ہے، انسانی عقل سے پوری طرح مطابقت نہیں رکھتے۔ ہمارے لیے عقلی طور پر یہ باور کرنا مشکل ہے کہ ہم مرکر حشر کے دن پھر زندہ کیسے جائیں گے، پھر ہم عقل کی رُو سے مسئلۂ تثلیث کو سمجھنے سے بھی قاصر ہیں۔ تین میں ایک اور ایک میں تین کا چکر

[1] REVOLT AGAINST REASON

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انسانی سمجھ سے بالاتر ہے۔خدا انسان کیونکر بن سکتا ہے . . . . یہ سب باتیں عقل سے ماورا ہیں اور اس لیے بڑی عجیب و غریب معلوم ہوتی ہیں مگر انہیں دل و جان سے تسلیم کرنے ہی میں ایمان کا راز مضمر ہے۔[۱]

عقل اور مذہب کے بارے میں یہ غیر یقینی موقف اختیار کرنے کی وجہ سے ان دونوں کو نقصان پہنچا۔اگر مجرد عقل کو رہنما اور ہادی بنا کر مذہب کا جائزہ لیا جاتا تو مذہب خرافات سے یکسر پاک ہوجاتا اور وہ خواہ انسان کے لطیف جذبات کی تسکین کا کوئی سامان فراہم کرتا یا نہ کرتا لیکن عقل کی اس سے ضرور تسلی اور تشفی ہوتی اور آئندہ کے لیے مذہب کے ارتقاء اور ترقی کا ایک راستہ ضرور متعین ہو جاتا۔ لیکن اس معاملے میں یقین اور حزم کے ساتھ کوئی موقف اختیار نہ کرنے کی وجہ سے مذہب نہ تو غیر عقلی عناصر سے پاک ہو سکا اور نہ اُس نے روحانی احساسات کی تسکین کے لیے کوئی سامان فراہم کیا۔ اس تحریک نے ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ لوگوں کے فکری جذبات کو بے لنگر کیا اور اُن کے احساسات و جذبات میں یکایک طوفان اٹھا دیا لیکن اس کے علمبرداروں میں نہ تو اتنا تدبر تھا اور نہ اتنی ہمت کہ وہ مضطرب ذہنوں کو یقین کی دولت عطا کر سکتے۔اس کام کے لیے دین کے اندر گہری بصیرت اور سائنس کے اکتشافات نے جو نئے مسائل پیدا کر دیئے تھے ان کی پوری سمجھ بوجھ اور ان مسائل کو مذہبی تعلیمات کی روشنی میں حل کرنے کی خصوصی مہارت درکار تھی۔لوتھر اور اس کے متبعین میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو اس عظیم کام کو سرانجام دینے کی ہمت رکھتا۔ اُن کے کارناموں کی مثال اُس شخص کی سی ہے جو کسی گھر کے اندر چند منکرات دیکھ کر لوگوں کو انہیں دُور کرنے کی دعوت دیتا ہے لیکن بُرائی اور بھلائی کے درمیان تمیز نہ کرنے کی وجہ سے انہیں پوری عمارت کو گرانے کا مشورہ دیتا ہے اور بڑے جوش کے ساتھ اُسے پیوندِ خاک کر دیتا ہے اور پھر اس خالی زمین کو اُن لوگوں کی تحویل میں دے دیتا ہے جو یہاں کھلے بندوں ہر قسم کے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔

---

[۱] CHARLES BEARD: THE REFORMATION P. 164.

© rasailojaraid.com